آصف فرّخی *

شکل طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز: انتظار حسین تنقید کے تناظر میں

"Do you see the story? Do you see anything?"

- Joseph Conrad

ایک طویل اور ثمر آور ادبی زندگی کے دوران انتظار حسین نے خود کو کم اور اردو افسانے کو زیادہ بدلا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں کا شاید سب سے عمدہ مطالعہ انتظار حسین کے افسانے ہی پیش کرتے ہیں اور تنقیدی عمل کے لیے جس تناظر کی ضرورت ہے، وہ ان ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود مختلف نقادوں نے ان کے کام کے بارے میں لکھا ہے۔ اور جو لکھا ہے اس کا مطالعہ اپنے موضوع کے ساتھ ساتھ اردو تنقید کے بدلتے ہوئے رجحانات اور اس مخصوص وقت میں جاری نظریات کا اندازہ لگانے کے لیے بڑی مفید نشانیاں فراہم کرتا ہے۔

ان واضح نشانیوں سے اغماض مشکل ہے، اس کے باوجود انتظار حسین کے افسانوی عمل کے بارے میں تنقید لکھنے کا سلسلہ جاری ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ اب ایک طرح کی کاٹیج انڈسٹری میں ڈھل جائے گا جو بصیرت افروز نہ ہوتے ہوئے بھی منفعت بخش ضرور ہے۔ سات آٹھ برس پہلے انتظار حسین کو 'ایک دبستان' قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے ان کے بارے میں تبصرے و مقالات جمع کیے تھے تو ساڑھے سات سو صفحات سے زیادہ کا دفتر مرتّب ہوا تھا۔ تب سے لے کر اب تک اتنا وافر مسالہ تو

فراہم ہو ہی گیا ہوگا کہ لگ بھگ اسی حجم کا ایک اور دفتر تیار ہو جائے۔ پھر جو تھوڑے سے بہت مضامین و اندراجات پہلی مرتبہ شامل ہونے سے رہ گئے، وہ اپنی جگہ۔ تنقید کی یہ فراوانی ہمیں کہاں لے جاتی ہے؟ میں تو اس ساری تنقید کو بھی ایک کہانی کی طرح پڑھتا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انتظار حسین کی افسانہ سازی میں ایسی کوئی طاقت موجود ہو کہ جس کو چھو جائے، اس کا افسانہ بنا دے۔ (حالانکہ مٹّی کو سونا بنا دینے والے کنگ میڈا اس کی طرح یہ عمل بھی آخر کار معجزے کے بجائے عذاب بن جاتا ہے) لیکن بات یوں بھی ہے کہ اس تنقید میں مجھے تو قصّے کے اچھے خاصے لوازم موجود نظر آتے ہیں۔۔۔ پلاٹ بھی ہے اور کردار بھی۔۔۔ (ہم اس پورے قصّے کو یولی سیز کی بھٹکی ہوئی تلاش کے ایک variant کے طور پر کیوں نہیں پڑھ سکتے؟) بلکہ عیّار، حجرہ ہائے ہفت بلا اور ولین تک دیکھے اور پڑھے جاسکتے ہیں۔ لوح نہیں ملتی اور کشاکش آگے بڑھتی ہے۔ بحران والا کلائمکس بس آنے کو ہے اور بشارت کا انتظار، آخر میں وہی ''بستی'' والی دبدھا کہ بشارت ہوئی کہ نہیں؟ کوئی جانے نہ جانے نقاد شاید اس سے زیادہ نہیں جانتے۔ انجام بلکہ resolution ابھی بہت دور ہے اور اس سے آگے اس کا تصور ممکن نہیں، اس لیے کہ الف لیلہ والی مادر سری افسانہ طراز شہرزاد کی طرح انتظار حسین نے کہانی ابھی یہیں تک سنائی ہے۔ کہانی کی اگلی منزل کے لیے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں دم لینا ضروری ہے۔

دم لینے کے لیے ٹھہرتے ٹھہرتے پچھلی منزلیں دھیان میں لامحالہ آتی ہیں، گئے زمانے کے تنقیدی مضامین سے زیادہ پرانی دُھرانی اور کوئی چیز ہوسکتی ہے؟ صرف ایک چیز کا خیال آتا ہے، عمر رائیگاں، وہ وقت جو ان مضامین کو پڑھنے میں صرف کیا گیا۔ یہ بات بھی مجھے ایک تنقیدی مضمون ہی میں ملی۔ برطانیہ کے عہد حاضر کی بے حد خلّاق ناول نگار اے ایس بائیٹ A. S. Byatt نے فکشن اور حقیقی زندگی کے تال میل کے بارے میں اپنے مضمون "True Stories and Facts in Fiction" میں تنقیدی استدلال قائم کرنے کے دوران یہ بھی لکھا ہے:

> The older I get, the more I habitually think of my own life as a relatively short episode in a long story of which it is a part.(1)

شاید اس طرح زندگی بھی جز و افسانہ ہے اور افسانہ بھی افسانہ در افسانہ۔ اور پھر ایک بڑی داستان سمجھ کر پڑھنا چاہتا ہوں اور تنقیدی مطالعات کو اس داستان میں گُندھے ہوئے چھوٹے بڑے افسانے۔ پھر جس طرح داستان کے آغاز میں سارے قصّے کی شرائط ایک واقعے یا اپنی سوڑ سے متعین ہوتی ہیں اور تعارف کے دوران ہم اس قصّے کی بنیاد بننے والے توافق یا تصادم سے واقف ہو جاتے ہیں، اسی طرح انتظار حسین کی تنقید کے اس سارے قصّے کے سرآغاز مجھے حسن عسکری کا مختصر تبصرہ جاتی مضمون نظر آتا ہے۔ اس کی اہمیت محض اتنی نہیں کہ یہ محمد حسن عسکری کا لکھا ہوا ہے جن کو مظفر علی سیّد نے اردو میں فکشن پر قلم اٹھانے والا اہم ترین نقاد قرار دیا تھا۔ تمام تنقیدی فیصلوں کی طرح یہ فیصلہ بھی ایک point بنانے کی خاطر مبالغے سے کام لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس میں کسی نہ کسی حد تک صداقت ضرور ہے۔ اپنے موضوع کی اہمیت کی صداقت، ہر چند کہ یہ فیصلہ مظفر علی سیّد نے جس وقت صادر کیا اس وقت تک اردو فکشن کی ساخت اور اساس پر شمس الرحمٰن فاروقی کا کام اپنی مکمل شکل میں سامنے نہیں آیا تھا۔ افسانے پر مضامین سے زیادہ داستان کے بارے میں چہار جلدی مطالعہ جو اردو فکشن کی اس دھند میں لپٹی اور گم شدہ اقلیم کو بحال کرنے کی تقریباً داستانی انداز ہی کی کاوش ہے۔ بہرحال اس کے باوجود محمد حسن عسکری کے مضمون کی اہمیت اپنی جگہ ہے کہ انتظار حسین کے افسانوں کی دید و دریافت کا قصّہ چھیڑ دیا جاتا ہے۔ تجزیے کا اصل کمال تو انہوں نے اس قصّے کی کم زور بنیاد یعنی انتظار حسین کے فن میں کمی اور کجی کے بیان میں دکھایا ہے۔ لیکن بعض نکتے ایسے اٹھائے ہیں کہ بعد میں آنے والی تنقید اس پر خاطر خواہ اضافہ نہیں کرسکی۔

عسکری صاحب کے مضمون کی اٹھان بڑے غضب کی ہے۔ پہلے تو انہوں نے افسانہ نگار کو ''باقیات الصالحات'' اور اپنا مقصد ''تنقیص'' نہیں بلکہ ان افسانوں کو ''سمجھنے'' کی کوشش قرار دیا ہے۔ اتنا کہہ کر پچکارنے کے بعد وہ کرشن چندر کے اثرات کی شکایت کرتے ہوئے (''اب تو ان کی خاصی عمر ہوگئی کرشن چندر کا اثر اتنے دن تک نہیں چلنا چاہیے'') افسانوی تاثر کا سارا بوجھ کرداروں کی انفعالیت پر مبنی ہونے، فضا کی رقّت خیزی، ''ایک اضمحلال اور ایک بڑھاپا'' اور پاکستان بننے، گھر بار چھوڑنے کے حادثے سے افسانوں کا محرک تلاش کرنے پر جو اعتراض کیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین پر لکھی جانے والی ساری تنقید ان چند شکایتوں کے دائرے میں گھوم رہی ہے۔ بظاہر آگے

بڑھتی ہے اور پھر یہیں لوٹ آتی ہے۔ خاص طور پر ''بستی'' کے بارے میں بعض تبصرے اسی اعتراض کی توسیع معلوم ہوتے ہیں۔ وقت گزرنے اور اپنے پڑھنے والوں کے احترام کی گرد میں انتظار حسین اگر اردو افسانے کا بُت بن گئے ہیں تو بت شکنی کے اس عمل میں پہلی ضرب لگانے کا اعزاز بہرحال عسکری صاحب کو جاتا ہے، اور یہ بات اردو تنقید میں ان کے مجموعی مقام کے پیش نظر بعید از قیاس بھی نہیں۔

انتظار حسین کے فنی نقائص کا بیان کتنا ہی ترغیب انگیز کیوں نہ ہو، مجھے اس مضمون کی اساس میں بھی ایک سقم نظر آتا ہے۔ ''گلی کوچے'' کے افسانوں تک آنے سے پہلے فاضل نقاد کو افسانے کی تعریف بیان کرنا پڑتی ہے۔ افسانے کی بنیادی تعریف اور وضع سے بات کا آغاز، نقاد کے بعد از اں استدلال کے باوجود ان افسانوں کی قوّت اور گہرائی کا بجائے خود ثبوت ہے جو نقاد کے نہیں، افسانہ نگار کے حق میں جاتا ہے۔ عسکری صاحب کا مضمون کہیں اور اتنا بودا اور پرانا نہیں معلوم ہوتا، جتنا افسانے کی اس تعریف میں۔ لیکن عسکری صاحب افسانے کی تعریف کے معاملے میں اپنے زمانے کے اسیر ہیں، جب کہ انتظار حسین اس زمانے اور اس کے افسانے سے بہت آگے نکل آئے اور اپنے ساتھ اردو افسانے کو ایک اور وضع کا اسیر کر دکھایا۔ جوئس سے دلچسپی ہونے کے باوجود بطور نقاد عسکری صاحب کی مشکل یہ ہے کہ وہ پلاٹ، کردار، واقعیت نگاری پر افسانے کی کامیابی کا سارا دارومدار قرار دے رہے ہیں جب کہ انتظار حسین کا زمانہ دیکھتے دیکھتے بدل جاتا ہے اور وہ کرشن چندر، منٹو اور مابعد کی سماجی حقیقت نگاری سے گزر کر کافکا، نابوکوف، جولیو کورتازر اور بورخیس جیسے تجربہ پسند افسانہ نگاروں کے زمانے میں سانس لینے لگتے ہیں جس کے لیے مختصر افسانے کا paradigm ہی بدلا ہوا ہے۔

افسانے کی یہ تعریف پھر عسکری صاحب کے پاؤں میں بیڑی بن کر رہ جاتی ہے جب وہ اشرف صبوحی کے ''کرداروں'' سے موازنہ کرنے لگتے ہیں۔ ''دّلی کی چند عجیب ہستیاں'' اپنے طور پر نہایت محترم ادبی کارنامہ ہے اور مخصوص تہذیبی رچاؤ کا جیتا جاگتا مرّقع لیکن ان ''عجیب ہستیوں'' کو افسانے کے کردار کی طرح برتنا یا حوالہ دینا، ناشپاتی اور سیب کا موازنہ ہے۔ اس کا سب سے دل چسپ استعمال عسکری صاحب نے مضمون کے آخری فقرے میں کیا ہے جو گویا خلاصۂ کلام ہے:

> آخر میں یہ تنبیہہ پھر ضروری ہے کہ میں انتظار کی خامیوں پر زور نہیں دے رہا ہوں۔ بلکہ صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ان تحریروں میں بعض کمزوریاں نہ ہوتیں تو ان کے افسانے اور بھی اچھے ہوتے... (۲)

لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ پھر یہ کیا بات ہوئی؟ اگر ان تحریروں میں بعض خوبیاں نہ ہوتیں تو ان کے افسانے اور بھی بُرے ہوتے۔

میں اس فقرے کو صیغۂ مستقبل کے بجائے ماضی میں جا کر پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ (کون سا ماضی؟ تمنائی یا شکّی؟) کہ ایسا نہ صرف ہوتا بلکہ ان کے بعض افسانے اور بُرے ہوئے بھی ہیں۔ فاضل افسانہ نگار اپنے نقادوں کی رائے پر کان دھرتے تو افسانے اور بھی بُرے ہو سکتے تھے۔ افسوس کہ یہ کہانی بن لکھی رہ گئی اور رزمیہ بھی نہ بن سکی۔

اس فیصلہ کن خاتمے سے فوراً پہلے عسکری صاحب نے ایک فقرہ ایسا لکھا ہے جو نقاد کے طور پر ان کی بصیرت و دروں بینی (insight) کا غماز ہے:

> انتظار میں کردار کا احساس بھی موجود ہے، فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں، زبان میں بھی روانی ہے، لیکن صحیح معنوں میں افسانہ وہ اسی وقت لکھ سکتے ہیں جب وہ اپنی یادوں پر قابو پالیں... (۳)

یہ نکتہ اگر ''گلی کوچے'' کے لیے درست تھا تو اس کے تقریباً نصف صدی بعد شائع ہونے والی اور تازہ ترین کتاب ''جستجو کیا ہے؟'' کے لیے بھی اتنا ہی دُرست جہاں انتظار صاحب کا خودسوانحی ماجرا یا امرِ واقعہ، یادوں کے تحلیل ہونے (resolution) سے قائم ہوتا ہے۔ باقی خوبیاں اپنی جگہ۔

عسکری صاحب کے مضمون کا ذکر میں نے تفصیل سے کیا ہے اس لیے کہ ایک تو مضمون اہم ہے پھر نہ جانے کیوں، ڈاکٹر ارتضٰی کریم کی کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ ایک اور تنقیدی حوالہ

عسکری صاحب کی ہم عصر اور بعض تہذیبی و تنقیدی معاملات میں ان کی ہم خیال، ممتاز شیریں کا ہے۔ ممتاز شیریں، نوجوان افسانہ نگار کے ابتدائی دور کے افسانے ''بن لکھی رزمیہ'' کی بہت قائل تھیں۔ اس حد تک کہ خود افسانہ نگار کو شکایت ہونے لگی تھی کہ دوسرے تمام افسانوں کو چھوڑ کر ''وہ کیوں ہر پھر کر اسی ایک افسانے کا ذکر کرتی تھیں۔''(۴) (بحوالہ، مظفر علی سیّد، ''انتظار ستان میں'') اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے ممتاز شیریں کی توجہ کا مرکز بنے رہے اور اس سلسلے میں ''بن لکھی رزمیہ'' کا حوالہ ناگزیر تھا۔ ''پاکستانی ادب کے چار سال'' نامی مضمون میں (مشمولہ معیار میں) انہوں نے لکھا:

> فسادات کو ایک وسیع سیاسی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ پیش کیا جا سکے اور پوری قوم کا تجزیہ ہو یا جا سکے تو پائے کی تخلیق ممکن ہے۔ فسادات پر کوئی تحریر اس معیار کے قریب آتی ہے تو وہ انتظار حسین کا افسانہ ''بن لکھی رزمیہ'' ہے۔
>
> ''بن لکھی رزمیہ'' میں ایک ''بڑا پن'' پایا جاتا ہے۔ بیس بائیس صفحوں کے اس افسانے میں اتنی تہیں ہیں اور اتنے پہلو سموئے گئے ہیں کہ اس کی گرفت میں ایک دور سمٹ آیا ہے...(۵)

یہ حوالہ ایسا نہیں کہ نظر انداز کیا جا سکے۔ لیکن ممتاز شیریں اس سے ایک قدم آگے بھی گئیں، جس کا ''گلی کوچے'' کے زمانے میں وہم و گمان تک نہ تھا۔ یہ حوالہ بھی مجھے اہم معلوم ہوتا ہے۔ افسانوی ادب میں ممتاز شیریں کی توجہ کا مرکز و محور فسادات کے افسانے اور خصوصیت کے ساتھ سعادت حسن منٹو کا کام بن گیا جس پر انہوں نے پوری ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ (''نوری نہ ناری'') اور آدم کے ازلی و ابدی گناہ اور پھر نجات کے عیسوی تصوّر کو منٹو کے افسانوی سفر کے ارتقائی مدارج پر منطبق کر کے دیکھا۔ یوں انہیں منٹو کے یہاں ''آدمی'' کا باقاعدہ یہ تصوّر محض ایک زاویۂ نظر معلوم ہوتا ہے — اس حوالے سے دیکھیے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''نیا قانون'' کا سیاسی طنز اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا زہر خند جو مہمل

کی حدود کو بھی پار کر لیتا ہے، کہاں اور کس حد تک ٹھیک بیٹھیں گے؟ لیکن ممتاز شیریں نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ یہ پورا تھیسس قائم کیا۔ وہ منٹو پر اس کتاب کو مکمل تو نہ کر سکیں لیکن تعطّل کے ایک وقفے کے بعد اپنی زندگی کے آخری دور میں دو مضامین لکھے (جن کو ''نوری نہ ناری'' کی ترتیب کے وقت اس کتاب میں شامل کیا گیا) جس میں سے ایک مضمون ''ادب میں انسان کا تصوّر'' بھی ہے۔ اس مضمون میں ان کا استدلال پوری طرح سے ایک جگہ مرتکز (focused) ہونے کے بجائے جائزے کا سا انداز لیے ہوئے ہے۔ وہ عیسوی اور اسلامی تصورات کا بھی ذکر کرتی ہیں اور دوستوفسکی، ٹوماس مان سے گزر کر سارتر اور کامیو کی طرف آ جاتی ہیں اور پھر ترقی پسند ادیبوں کے ہاں ''نئے انسان کی متوقع پیدائش'' کے برخلاف منٹو کے ہاں انسان کے تصور کو مختلف افسانوں میں درجہ بدرجہ ارتقاء پاتے ہوئے دیکھتی ہیں جو اس سلسلے کے پچھلے مضامین میں وہ قدرے تفصیل کے ساتھ لکھ چکی ہیں مگر اتنے وسیع تناظر کے ساتھ نہیں۔ منٹو کے فوراً بعد کے افسانوں میں بھی ان کو ''سماجی انسان'' کا تصوّر، جو ان کے حساب سے بہت محدود تھا، حاوی نظر آتا ہے۔ مگر بس ایک افسانہ نگار اس حد کو توڑ کر آگے نکلتا ہے۔ اور وہ ہے انتظار حسین۔ اس مضمون میں ان کا حوالہ بڑی باضابطگی اور پورے طمطراق کے ساتھ آتا ہے:

> ہمارے ہاں انتظار حسین نئے ادب کے ایک نمائندہ افسانہ نگار اور وقیع فنکار ہیں۔ انہوں نے اپنے مجموعے ''آخری آدمی'' میں ماضی کے استعارے سے پرانی داستانوں، انجیلی حکایات اور قرآنی تلمیحات کے ذریعے موجودہ دور کے انسان کا اخلاقی اور روحانی زوال دکھایا ہے۔ انہیں فرد کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے اخلاقی زوال کا بھی غم ہے...(۶)

اس کے بعد انتظار حسین کے ایک جُملے کا اقتباس ہے کہ ''دلّی کی جامع مسجد کو تو ہندوؤں نے آگ لگائی، پر داتا صاحب کے مینار کس نے گرائے؟''(۷)

عجیب بات ہے کہ یہ فقرہ آج کے دور میں زیادہ معنی خیز معلوم ہوتا ہے، جب کہ خانقاہوں،

درگاہوں پر حملے معمول کی بات بن گئے ہیں۔ ان حملوں کی زد میں داتا دربار بھی آچکا ہے اور انتظار حسین کے اس کردار کا سوال پہلے کے مقابلے میں آج زیادہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں اس مجموعے کے کئی افسانوں کا حوالہ دے کر ان میں موجود ''روحانی انحطاط اور اخلاقی زوال کی مجسّم [علامتوں]'' کی نشان دہی کرتی ہیں۔ قرآنی آیات دہراتے ہوئے وہ فوراً ''آخری آدمی'' کی طرف آجاتی ہیں۔

> انتظار حسین کا ''آخری آدمی'' الیاسف آخر تک اپنی آدمیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن بے سود، ایک ایک کر کے اس کی ساری انسانی صلاحیتیں اور قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ایک بندر، ایک چوپایہ میں تبدیل ہو جاتا ہے... (۸)

اس سے آگے بڑھ کر وہ ایونیسکو کے ڈرامے ''گینڈے'' کا ذکر کرتی ہیں جس میں سارے انسان ایک ایک کر کے گینڈے میں تبدیل ہوئے جا رہے ہیں، اور پھر دونوں فن پاروں کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> خواہ Ionesco کا Rhinoceros ہو یا انتظار حسین کا ''آخری آدمی''، آج کے ادب میں انسان کا ایک نمایاں تصور Dehumanised انسان کا ہے... (۹)

یہاں یہ تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعض نقادوں نے اس قصّے کے انجیلی مآخذ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انتظار حسین کے افسانے پر ایونیسکو کے ڈرامے سے متاثر ہونے کا الزام لگایا۔ ممتاز شیریں چوں کہ اپنے مقالے کا سارا مواد انجیل اور عیسوی روایات سے اٹھا رہی ہیں، اس لیے ان کی نظر اصل مآخذ پر رہی۔ اس کے باوجود ان کے مضمون میں اس افسانے کے متن میں جھانکنے اور اس کی تہہ میں اترنے سے زیادہ، اس کو ایک وسیع تر تناظر میں رکھ کر دیکھا گیا ہے جو وسعتِ نظر کا اظہار

ہے، دقتِ نظر کا نہیں۔ انتظار حسین کی افسانوی کائنات کے مدار میں ان کی گردش بس اس قدر ہے۔ ممتاز شیریں کی یہ نظرے خوش گزرے بھی exception ہے، rule نہیں کیوں کہ جلد ہی انتظار حسین کے افسانوں کے بارے میں ایک تنقیدی روش سی بن گئی جس سے بس چند ایک نقاد ہی مستثنیٰ رہ پائے۔ اس تنقیدی روش اور اس میں درجہ بدرجہ سامنے آنے والے مراحل کی نشان دہی سہیل احمد خان نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کی ہے:

> انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا سفر حقیقی معنوں میں ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوا۔ تب سے اب تک ان کی کہانیوں کے بارے میں تنقیدی ردِعمل کو سامنے رکھیں تو نقشہ کچھ یوں بنتا ہے، ''گلی کوچے''، ''کنکری''، ''چاند گہن'' اور ''دن اور داستان'' کو ایک حد تک بے تعلقی کی فضا ملی۔ ''آخری آدمی'' پر مخالفانہ ردِعمل ظاہر ہوا۔ داستانی اندازِ تحریر اور انسانوں کی جانوروں کے روپ میں کایا کلپ کو نشانۂ طنز بننا پڑا مگر اس مجموعے کے بعد ہی سے بے تعلقی کی برف پگھلی۔ پھر ''شہرِ افسوس'' اور بالخصوص ان کے ناول ''بستی'' پر جس طرح توجہ ہوئی اس سے ہمارے ادبی قارئین بخوبی آشنا ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بے تعلق یا مخالفانہ ردِعمل ختم ہو گیا لیکن اس ردِعمل کی قوّت میں کمی آ گئی اور اب ایک نئے رجحان کے پیش رو کے طور پر قبولیت کا انداز نمایاں ہے... (۱۰)

اب اس بحث میں الجھنے کا فائدہ نہیں کہ اس نقشے میں کتنی تفصیلات دُرست ہیں، اس لیے کہ یہ روش بھی پامال ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نقشے کو اگر دیکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کی شکل کچھ اس طرح بنتی ہے کہ جدول کی ایک axis پر وقت ہے جو تیزی کے ساتھ آگے کی سمت بڑھ رہا ہے اور اس کے دوسری طرف انتظار حسین کا فن و ہنر جو ریاضی کے قاعدے والا constant نہیں ہے، وقت کی طرح خود بھی حرکت میں ہے، اوپر یا آگے کی طرف جا رہا ہے۔ تاہم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انتظار حسین اور تنقید کے قصّے میں وقت کے ساتھ پلاٹ گہرا اور گھنا (the plot thickens) ہوتا جا رہا ہے۔ اس

کیفیت کے بیان کے لیے مجھے بیسویں صدی کے نصف آخر کے برطانوی ناول نگار انتھونی پاویل (Anthony Powell) کے کئی جلدوں پر مشتمل سلسلہ وار ناول *A Dance to the Music of Time* کا نام یاد آکر رہ جاتا ہے۔ اس ناول کو کسی زمانے میں انگریزی کے نقادوں نے ''پراؤستین'' قرار دیا تھا۔ ناول میں کسی کو پراؤسٹ کا سا انداز کہاں نصیب ہونا تھا، اس کے نام میں ایک رمزیت نظر آتی ہے — رقص جاری رہتا ہے، رقص کرنے والے بدلتے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے کوئی کسی کے مقابل آجاتا ہے، پھر اپنے رقص میں گم ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے کوئی کسی کے مقابل آجاتا ہے، پھر اپنے رقص میں گم ہو جاتا ہے، اور اس پورے عرصے میں موسیقی جاری رہتی ہے، وہ غنائیہ جو وقت ہے۔

وقت کتنا گزر گیا ہوگا اور اس عرصے میں خود انتظار حسین کا فن بھی گوناگوں تبدیلیوں سے دوچار رہا ہوگا۔ اس کا اندازہ سہیل احمد خان کے اس مضمون کے بعد افسانہ ''کشتی'' پر ان کے تجزیاتی مضمون (''طوفان مچھلی اور کشتی'') کو پڑھنے سے ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ اہم مضمون بھی ارتضیٰ کریم والی تالیف سے غائب ہے۔ ''کشتی'' بعد کے افسانوں میں خاصی اہمیت کا حامل ہے اور اپنا واقعاتی عمل کئی تہذیبوں کے cross-current سے حاصل کرتا ہے، ایک تہذیب کا بیان دوسری تہذیب کی شاخ ہے شگوفہ بن کر پھوٹتا ہے۔ ایک تہذیب کا قصہ دوسرے کو جاری رکھتا ہے اور آگے بڑھاتا ہے اور یوں افسانے کی مجموعی کیفیت ایک ایسے امتزاج سے عبارت ہے جس میں مختلف تہذیبیں ایک ہی کہانی کی جزئیات بن جاتی ہیں۔ افسانے کا انداز بدلا ہوا ہے۔ اس کی مناسبت سے تنقید بھی مختلف نوعیت کی ہے۔ افسانے میں بروئے کار آنے والی علامات کی تہذیبی معنویت کی تشریح بہت معلومات افزا اور بصیرت افروز ہے — شاید ہی کسی افسانے کا اس انداز میں تجزیہ کیا گیا ہو۔ خاص طور پر مرسیا ''ایلیاڈ'' کے حوالے سے تاریخ کے پار جاکر ''عجیب'' اور نادر وقت میں سانس لینے کی کیفیت کا ذکر ایک جہت کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ مضمون کے پورا ہوتے ہوتے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ تہذیبی پس منظر اور رمزیت کے بیان میں زیادہ زور صرف ہوا ہے۔ تکنیک اور زبان کا حوالہ ضرور دیا گیا ہے لیکن وہ مضمون کے دیگر لوازمات میں دب سا جاتا ہے۔ شاید ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا کیوں کہ طوفان مچھلی اور کشتی کی علامتیں آفاقی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ افسانے میں طوفان اس زور سے اس سے پہلے کہاں اُبھرا ہوگا۔

زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو انتظار حسین کے دو نقادوں کے کام کو سہیل احمد کے مضمون سے پہلے دیکھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلے نقاد نذیر احمد ہیں جنھوں نے ساٹھ کے عشرے تک اہم افسانہ نگاروں پر مستقل تجزیاتی مضامین لکھے لیکن اس پیش روی کے باوجود، فکشن کی تنقید کے زیادہ زور شور کے ساتھ لکھے جانے کے اس زمانے میں اس کا نام کہیں دیکھنے میں بھی نہیں آتا۔ پلاٹ اور کردار کے روائتی لوازم سے آگے بڑھ کر ''آخری آدمی'' کے ذکر تک آتے آتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران گائے نے اپنا سینگ بدل لیا ہے۔ پاؤں تلے زمین نے جھرجھری لی ہے، اب ہواؤں کا رخ بدلنے والا ہے۔ ابتدائی افسانوں کے بارے میں نقطۂ نظر از کار رفتہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر ابتدائی دور کے افسانے ''جنگل'' کے بارے میں نقاد نے لکھ دیا ہے کہ یہ ''امرد پرستی کے میلان میں لکھا گیا ہے۔''(۱۱) اس طرح افسانے میں تجسّس اور خوف کی فضا اور اس دوران جنسی ترغیب کی بیداری کو یک رُخی اور سطحی طور پر ایک لفظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ یوں افسانے کی تفہیم شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے اور تنقید اپنی افادیت سے محروم۔ گھاس میں سرسراتا ہوا سانپ واپس زمین کی تہوں میں اُتر جاتا ہے۔ اس زمانے کے نقادوں میں مظفر علی سیّد دوسروں سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں — کچھ اپنی جودتِ طبع کی بدولت اور کچھ ناصر کاظمی، احمد مشتاق اور انتظار حسین سے رفاقت کے باعث جس کا حوالہ انتظار صاحب کی غیر افسانوی تحریروں میں اتنی بار آیا ہے کہ اردو ادب کے طالب علموں کو از بر ہو چکا ہے۔ مظفر علی سیّد نے ''بستی'' پر تفصیل کے ساتھ لکھا جو نہ صرف ان کے عمدہ تنقیدی مطالعات میں سے ایک ہے بلکہ انتظار حسین کے بارے میں لکھے جانے والے سب سے اچھے مضامین میں گنے جانے کے لائق ہے۔ وہ ناول کو اس کی کُلیّت میں، یعنی ایک نامیاتی پیکر کے طور پر بھی دیکھتے ہیں اور اس کے مختلف اجزاء کی سیاسی/ تاریخی اور ادبی معنویت کو بھی جیسے دھوپ کے رُخ پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ مظفر علی سیّد ایک ایسے نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں جو انتظار حسین کے کام اور مقام سے پوری طرح نبرد آزما ہونے (engage) کے لیے کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیار ہیں۔ اسی لیے افسانوں پر ان کے مضمون سے، جو ''بستی'' والے مضمون کے بعد لکھا گیا، بہت توقع بندھتی ہے، مگر افسوس کہ ''انتظارستان'' نام کا مضمون اس بارے میں مایوس کرتا ہے۔ غالب کے نسخۂ حمیدیہ والے شعر سے اخذ کردہ عنوان ایک لمحے کے

لیے حیران ضرور کرتا ہے مگر مضمون کے متن میں ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد یہ حیرت اور انکشاف کی توقع زیادہ دیر تک ہمارے ساتھ نہیں چلتی۔ ایسا لگتا ہے کہ نقاد نے خاکہ تو پوری محنت سے بنایا ہے لیکن جب رنگ بھرنے کا وقت آیا تو باریک بینی اور نفاست سے کام کرنے کے بجائے بڑے بڑے اسٹروک لگا کر کسی نہ کسی طرح تصویر کو بس پورا کر ہی دیا۔ مضمون میں بعض نکتے یقیناً مفید ہیں لیکن اگر ہم دریافت کرنا چاہیں کہ کیا اسے پڑھ کر انتظار حسین کی فکر و فن کے کچھ نئے گوشے ہم پر اجاگر ہوتے ہیں یا ہمیں کوئی ایسی بصیرت حاصل ہوتی ہے جو اس سے پہلے ہمارے مطالعے میں نہیں آئی تھی تو اس کا جواب اثبات میں نہیں ملتا۔ یہ مضمون اس طرح کے تنقیدی مطالعے کے برابر نہیں پڑتا جو مظفر علی سیّد نے انتظار حسین کے نسبتاً کم عمر معاصر محمد منشا یاد پر اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ اب یہ معاملہ نقاد کی موضوع سے رغبت اور دل کشی کا نہیں بلکہ فکری استعداد کا ہے۔ اور اس معاملے میں انتظار حسین افسانے کے اچھے سے اچھے نقاد کے چھکّے چھڑا دینے کے لیے کافی ہیں۔

مظفر علی سیّد کا ''انتظارستان'' شاید اس لیے دب سا گیا کہ اس وقت تک انتظار حسین ہم عصر تنقید کو آمادۂ پیکار رکھنے والا موضوع بن چکے تھے اور ان کی مختلف جہات پر مضامین تواتر سے لکھے جانے لگے تھے۔ ان مضامین میں جیلانی کامران کا عمومی مضمون، ڈاکٹر وزیر آغا کے قلم سے ناول تذکرہ کا تجزیہ اور سراج مُنیر کے مضامین شامل ہیں۔ سراج مُنیر کے مضمون کے آخر میں ۱۹۷۶ء کی تاریخ درج ہے اور اس کا یہ نکتہ پہلے کے مقابلے میں آج اور بھی زیادہ برمحل معلوم ہوتا ہے:

> انتظار حسین کے ہاں اگر ہم ''گلی کوچے'' سے ''شہرافسوس'' تک کا سارا سلسلہ نظر میں رکھیں اور ان میں اسلوب کی تبدیلیوں پر نگاہ ڈالیں تو یہ اندازہ ہوگا کہ انتظار حسین کے ہاں اردو کہانی کا تقریباً ہر قابل ذکر اسلوب موجود ہے اور اس طرح انتظار حسین کے ادبی کیریئر میں اردو کہانی کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا دیا۔۔ (۱۲)

ذکر چھیڑتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ ایسے touch and go والے روّیے کے باوجود میں ان مضامین کو اہم سمجھتا ہوں۔ لیکن انتظار حسین کی تنقید کی داستان کا water-shed event جس تحریر کو سمجھنا چاہیے وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون ہے۔ جو نئی پرانی سبھی کہانیوں کا نئے سرے سے اور ادبی و تہذیبی سیاق وسباق میں جائزہ لے کر تنقید کی سمت کا تعیّن کر دیتا ہے۔ نارنگ صاحب کے اس مضمون سے پہلے خاص طور پر ہندوستان سے انتظار حسین کے بارے میں جو تنقید آ رہی تھی وہ اپنی اساس میں نظریاتی تھی۔ وحید اختر اور انور عظیم کے تجزیاتی مضامین کی اہمیت کو میں کم نہیں کرنا چاہتا لیکن ان کی توجّہ کا محور انتظار حسین کے نظریاتی روّیے اور ان کی اختیار کردہ position رہی ہیں، وہ بھی تہذیبی یا سیاسی، سماجی حوالے سے۔ ان کو انتظار حسین کے فنّی اختصاص سے اگر دل چسپی رہی بھی ہے تو برائے بیت۔ نارنگ صاحب نے اس نظریاتی بحث کو بھی سیاسی، سماجی تجزیے سے بڑھ کر تہذیبی عمل سے جوڑ کر دیکھنے کا طریقہ برت کر دکھایا۔ پھر یوں ہوا کہ انتظار حسین کا فن بھی کسی ایک مقام پر پہنچ کر جامد نہیں ہو گیا بلکہ ''شہرافسوس'' کے بعد سے ان کے افسانوں میں شخصی واردات تہذیبی علامتوں کی شکل میں نمودار ہونے لگی، اور ان تبدیلیوں کی تفہیم کے لیے جس نہج پر مطالعے کی ضرورت تھی، اس کا سراغ نارنگ صاحب کے تفصیلی مضمون سے ملا۔ یوں یہ قصّہ اب ایک نئی منزل میں داخل ہوا چاہتا ہے۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے انتظار حسین کے بارے میں تنقید کا محاورہ بدل گیا ہے۔ اس بدلے ہوئے محاورے میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ انتظار حسین کے بارے میں قلم اٹھانے والے نقادوں میں ہندوستان کے شمیم حنفی خاص طور پر نمایاں ہیں۔ انہوں نے تذکرہ پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، حالاں کہ بستی کے مقابلے میں اس ناول پر کم توجّہ دی گئی ہے۔ اور تازہ کتاب جستجو کیا ہے؟ پر بھی الگ سے مقالہ لکھا ہے جس میں اس کتاب کا جائزہ ان کے پورے کام کو تناظر میں رکھتے ہوئے اس طرح لیا گیا ہے کہ انتظار حسین، جو اپنی ماضی پرستی کے لیے مشہور بلکہ کسی قدر بدنام بھی ہیں، زمانۂ حال کے اندوہ و ملال سے پیوستہ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تذکرہ کے بارے میں لکھتے ہوئے شمیم حنفی نے

تا ہے اور یوں ایک بار پھر انتظار حسین کی ''ہم عصریت'' کا تسلسل مزید گہرا ہو جاتا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی کے تجزیاتی مضامین کے پس منظر میں یہ تبدیل شدہ صورتِ حال بھی موجود ہے (اور یہ مضامین بیں اس تبدیلی کا جزو ہیں) کہ اردو میں افسانوی ادب کے تنقیدی مطالعے کا رواج بڑھنے لگا تھا جو ماضی قریب کی تنقید میں افسانوی ادب کو بڑی حد تک نظر انداز کرتے ہوئے زیادہ توجہ شاعری کی طرف مرکوز رکھنے کے رجحان سے مختلف تھا۔ اسی رجحان کی وجہ سے انتظار حسین نے اردو تنقید کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے کا طعنہ بھی دیا تھا۔ گویا انتظار حسین کی بدولت اردو تنقید کو دوسری ٹانگ بھی حرکت میں لانے کا موقع ملا ورنہ وہ یوں ہی سُن ہوئی جا رہی تھی۔ ٹانگیں کتنی بھی ہوں، خاص طور پر ہندوستان میں اس رجحان نے زیادہ پرورش پائی اور فکشن پر تنقید کی کئی اہم مثالیں سامنے آئیں۔ گوپی چند نارنگ اور شمیم حنفی کے اسم ہائے گرامی اس سلسلے میں شامل ہیں لیکن فکشن پر حالیہ توجہ کا ذکر ہو تو دو نام فوراً ذہن میں آتے ہیں جو انتظار حسین پر تنقید میں محض ضمنی حوالہ بنے رہتے ہیں۔ میری مراد شمس الرحمٰن فاروقی اور وارث علوی سے ہے جن کا معاصر اردو تنقید میں مقام بہت نمایاں ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو اردو فکشن کے اہم ترین نقادوں میں شامل کیا جاتا ہے، اس کا حوالہ پچھلے صفحات پر دیا جا چکا ہے۔ ان کو داستان سے بھی دل چسپی ہے اور جدید افسانے سے بھی، جس ضمن میں انہوں نے سریندر پرکاش اور انور سجاد کے افسانوں میں اسلوبیاتی وضع اور شعریات نثر کی کارفرمائی پر خاص تفصیل کے ساتھ لکھا بھی ہے۔ فاروقی صاحب نے ''علامتوں کا زوال'' پر قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا اور اسے ''اس زمانے کی اہم تنقیدی کتابوں'' میں شمار کیا ہے۔ اور اس خصوصیت پر زور دیا ہے کہ ایسی تنقید صرف انتظار حسین جیسا افسانہ نگار لکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہوا؟ نقادِ انتظار حسین سے گزر کر افسانہ نگار انتظار حسین کو وہ کسی تفصیلی مقالے کا موضوع نہیں بناتے۔ حالاں کہ ''افسانے کی حمایت میں'' میں شامل مضامین میں انہوں نے جا بجا انتظار حسین کا حوالہ دیا ہے اور ایک آدھ جگہ ان کا نام مثال دینے کے لیے سامنے لائے ہیں۔ لیکن یہ حوالہ بس حوالہ ہی رہتا ہے۔

وارث علوی کی تنقید میں افسانے کے لیے جس بصیرت افروزی کا مظاہرہ ہوتا ہے اس کا اطلاق انتظار حسین پر کم ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ یہ حوالہ سرے سے مفقود ہو۔ وہ انتظار حسین کے لیے

بہت احترام کا اظہار کرتے ہیں، اور کہیں کہیں تو اس میں غلو کا عنصر حاوی ہونے لگتا ہے۔ ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' میں انتظار حسین کے افسانوں میں وہ ''اسلوب کا جادو'' کارفرما دیکھتے ہیں جو ''غنائی شاعری کے اسلوب کی مانند ہم پر وجد کی کیفیت طاری کرتا ہے۔'' وہ اسے نثر کی معراج قرار دیتے ہیں اور مادام بواری والے فلابیر کو بالکل ہی فراموش کر جاتے ہیں جس کے لیے عقیدت کا وہ بارہا اظہار کر چکے ہیں اور جو ناول میں نثری اسلوب کے لیے اس غنائی جادو سے مختلف خیال رکھتا تھا۔ یہ سب بھول بھال کر وہ نثر کے معجزے پر آسمانی صحائف کو یاد کرنے لگتے ہیں جس کے اثرات انتظار حسین کی نثر میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ وارث علوی اسلوب پر تو داد دیتے ہیں، لیکن اسی مضمون میں اس سے پہلے ایک جگہ وہ انتظار حسین کے افسانوں میں تکرار کا شکوہ کرتے ہیں اور وہ بھی قرۃ العین حیدر کی ہم راہی میں، جو اس نوع کے بیانات کو اور بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ وارث علوی نے لکھا:

> دوسروں کا کیا ذکر آپ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو دیکھ لیجیے جو ہمارے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ کیا یہ دونوں تکرار کا شکار نہیں ہوئے۔ کیا مس حیدر کے متعلق یہ بات نہیں کہی جاتی کہ وہ ایک ہی ناول کو بار بار لکھ رہی ہیں۔ کیا انتظار حسین کے یہاں ہجرت، ماضی کی بازیافت اور بے جڑی کے احساس کی تکرار نہیں ہے۔ کیا ان دونوں کے یہاں ایک ہی قسم کے کردار اور افسانے سے دوسرے افسانے میں اور ایک ناول سے دوسرے ناول میں گھس بیٹھ کرتے نظر نہیں آتے۔ کم از کم آپ یہ بات منٹو، بیدی، عصمت اور غلام عباس کے افسانوں کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ (۱۳)

قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین سے بیک وقت فاضل نقاد کی مایوسی محلِ نظر لیکن نہ تو کسی ناول نگار کو قاری کی توقعات کا پابند کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے اپنے تجربات کے دائرے سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ اور پھر یہ بات، کوئی بھی بات، منٹو، بیدی، عصمت اور غلام عباس کے لیے کیوں کہی جائے؟ ان کے متعلق وہ بات کہی جائے جو ان کے افسانوں کے متعلق ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے قرۃ العین حیدر اور

انتظار حسین کے بارے میں وہ باتیں نہیں کہی جا سکتیں جو ان افسانہ نگاروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں۔ اس سے کسی کی قدر و منزلت میں کیا کمی آئی؟ لیکن منٹو، بیدی، عصمت اور غلام عباس کے نام یہاں پڑھ کر مجھے سہیل احمد خاں کا وہ مضمون ایک بار پھر یاد آ گیا، جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں۔ انتظار حسین پر تنقید کی بدلتی ہوئی روش کا نقشہ کھینچتے ہوئے انہوں نے بقول خود، ستارہ شناسی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ادبی تاریخ میں ایک عہد میں قبول کر لیا جانا بھی ادیب کی حتمی تقدیر نہیں، میرا خیال ہے کہ قبولیت کے اس دور کے بعد شاید تنقید اور تجزیے کا ایک اور دور آئے جس کا لہجہ کچھ اور ہو مگر وہ دور بھی گزر جائے گا اور پھر جو مقام انتظار حسین کو ملے گا وہی افسانے کی تاریخ میں اس کا حقیقی مقام ہوگا۔ توقع بندھتی ہے کہ منٹو، بیدی اور غلام عباس کے بعد قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو اس دور کے اہم ترین افسانہ نگار سمجھا جائے گا...(۱۴)

وارث علوی کے شکوے شکایت سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور اب آ گیا۔ زمانہ تو رقص میں آ کر اپنی چال چل گیا، دیکھنا یہ ہے کہ تنقید اب کیا نئے گل کھلاتی ہے۔ اور اس کی روشنی میں یہ افسانے ہمارے گزشتہ و آئندہ کو کس طرح پڑھتے ہیں۔

لیکن یہ تو اگلے قدم کی بات ہے۔ آگے قدم بڑھانے میں اونچ نیچ تو ہوگی۔ انتظار حسین پر لکھی جانے والی تنقید کا سارا ماجرا میں نے اب تک فراز (high points) کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ احوال ادھورا رہ جائے گا اگر اس میں کچھ نہ کچھ حوالہ نشیب کا نہ ہو کہ پانی کہاں کہاں مرتا ہے۔ وارث علوی اور ان کے ہم خیال محترم نقادوں نے بارہا گلہ کیا ہے کہ انتظار حسین کے ہاں تکرار بہت ہے، بعض باتوں کا ادّعا کثرتِ معنی کے امکان کو ختم کر کے یکسانیت پیدا کر دیتا ہے۔ حیرت کی بات ہے اور نہیں بھی کہ ایسی تکرار تنقید میں تھوک کے بھاؤ ملتی ہے۔ انتظار حسین بھی قرۃ العین حیدر کی طرح ہیں جن کے بارے میں گھسی پٹی باتیں بہت دہرائی گئی ہیں، ان کے اوائل عمری کے کام کے خلاف پیدا ہونے والے ردعمل اور تعصبات جو اب تک جاری ہیں جب کہ دونوں افسانہ نگاروں کے کام میں بڑی

دور رس تبدیلیاں آئے ہوئے بھی مدّت گزر چکی۔ میں ان مقالوں کا محض مجموعی حوالہ دے کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں جن میں بہت زور قلم اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ انتظار حسین کے افسانے، افسانے ہیں بھی کہ نہیں (یاد کیجیے عسکری صاحب کا مضمون) اور بستی کو کیا ناول گردانا جا سکتا ہے؟ یا پھر بستی کا فلاں کردار دراصل فلاں شخص پر مبنی تھا۔ ایسی دور کی کوڑیاں بوجھ بجھکڑوں کو مبارک، ان سے تنقید کا فریضہ پورا نہیں ہوتا۔ پھر ناول کے ہونے نہ ہونے کی بات بھی ایسے محدود تصوّر پر مبنی ہے جس میں اس صنف کی پہنائی اور امکان بھر وسعت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ان سے صرفِ نظر کر کے میں ایک آدھ مضمون کا مزید حوالہ دینا چاہوں گا۔ انتظار حسین پر لکھی جانے والی تمام تنقید میں ایک مختلف استثنائی اہمیت محمد عمر میمن کے مضمون ''حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت'' کو حاصل ہے جو علامتوں کو اس کے تہذیبی پس منظر میں ٹانک کر ان کی گنتی کر دینے کے محدود عمل کے بجائے ان کی تہہ میں اترنے اور ان کی تہہ میں موجود حافظے، اوائلی خوف اور یادداشت کے مضمرات کو چھاننے پھٹکنے کی ایسی کوشش کرتا ہے جو اردو تنقید میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اس مضمون کا آغاز مارسل پروست کے ایک فقرے کو انتظار حسین کی زبان میں یوں ادا کرتا ہے:

> کسی خاص شکل کو یاد کرنے کے معنی ہیں کسی خاص لمحے کا افسوس کرنا۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ گھر اور گلیاں اور کوچے بھی گزرتے برسوں کی مثال گزرتے چلے جاتے ہیں...(۱۵)

اس فقرے سے فوراً خیال کی ایک رو چل پڑتی ہے۔ جب گلیاں اور کوچے بھی گزرتے برسوں کی مثال گزرتے چلے جانے لگیں تو اسی سے افسانے بنتے ہیں اور پھر گزرتے برسوں کے ساتھ افسانے بھی بدلتے چلے جاتے ہیں۔

ماضی سے بے پناہ شغف کے باوجود انتظار حسین کے ہاں ماضی ساکت اور منجمد نہیں رہا۔ رنگین پناہ گاہ کے بجائے ماضی انتشار اور انقطاع کا باعث بھی بنتا ہے یہ نکتہ مسعود اشعر نے ''آگے سمندر ہے'' پر اپنے مضمون میں اٹھایا ہے۔ روائتی اور مکتبی قسم کا تنقیدی مقالہ نہ ہونے کے باوجود یہ مضمون اس

لحاظ سے اہم ہے کہ انتظار حسین کی اس کتاب پر توجہ مرکوز کرتا ہے جسے بدگمانی اور مغالطّوں کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ وقت کا یہی بدلا ہوا تصوّر کسی قدر وضاحت کے ساتھ ''جستجو کیا ہے؟'' کے ان آخری صفحات میں سامنے آتا ہے جہاں افسانہ نگار اپنے قصّے کی بساط سمیٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جن صفحات کو ابھی نقادوں نے کھنگالنا بس شروع ہی کیا ہے۔ اس باب کا نام ہے ''کہنے والے کا بھلا سننے والے کا بھلا'' اور اس کو مصنف نے اس طرح شروع کیا ہے: ''قصّہ تمام ہوا اور قصّہ باقی ہے ...''(۱۶)

انتظار حسین کے فکر و فن پر لکھی جانے والی تنقید کی بھی بس اتنی سی بات ہے۔ گھوم پھر کر قصّہ ایک بار پھر شروع ہوتا ہے۔

علیحدہ علیحدہ مضامین کی چھان پھٹک سے قطع نظر، چند ایک باتیں اس تنقیدی سرمائے کے بارے میں بھی کہی جانی چاہئیں، معیار کے حساب سے بھی اور مقدار بھی۔ دو ایک ناموں کو چھوڑ کر اسی دور کے اکثر اہم نقادوں نے انتظار حسین کی افسانہ نگاری پر رائے زنی کی ہے۔ وہ اپنے نقادوں کے لیے ایک بھاری پتھر کی طرح رہے ہیں جس سے کترا کر نکلنا ممکن نہیں۔ یہ انتظار حسین سے زیادہ ان کے نقادوں کی مجبوری ہے اور پھر نقادوں نے لکھنے میں کوئی کمی بھی نہیں کی۔ گوناگوں نقادوں کے اور مختلف اوقات میں لکھے جانے والے مضامین کی تعداد بھی اردو افسانے پر تنقید کا عام رجحان دیکھتے ہوئے خاطر خواہ ہے۔ دور جانے کی بات نہیں، مظفر علی سیّد اور سہیل احمد خاں نے اس دور کے باکمال افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے عصمت چغتائی اور غلام عباس کا نام لیا ہے۔ ذرا ان باکمال افسانہ نگاروں کے حوالے سے تنقیدی سرمائے پر نظر ڈالیے۔ دو چار مضامین کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اور بے اعتنائی کا یہ سفر آگے چلتا جائے گا۔ انتظار حسین کے فوراً بعد ادبی افق پر نمودار ہونے والے اور ہمارے آپ کے ان دنوں تک اپنا سکّہ جمائے رکھنے والے معاصرین میں خالدہ حسین، حسن منظر اور اسد محمد خان جیسے افسانہ نگاروں کے نام باآسانی لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں اگر عمومی تبصروں کو چھوڑ دیں تو ایک آدھ ہی مضمون ملے گا۔ ہمارے نقاد ایسے ہنرمند افسانہ نگاروں سے محرک حاصل کر سکے اور نہ وابستگی و پیوستگی کا کوئی sustained موقع۔ انتظار حسین کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شاید ایک منٹو کو چھوڑ کر اردو کے کسی اور افسانہ نگار کے گرد اتنا تنقیدی مجمع اکٹھا نہیں ہوا نہ ایسا سرمایہ بہم ہوا ہے۔ اور اس ڈھیر میں چنگاریاں بھی موجود ہیں، معقول مضامین کا تناسب

بھی کسی طرح کم نہیں۔ نقادوں کو اتنا سرگرم رکھنا بھی بہر حال انتظار حسین کا اعجازِ فن سمجھا جانا چاہیے۔ اور اب مطالعۂ انتظار حسین کی توسیع ہندی اور انگریزی میں نظر آ رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میں نمودار ہونے والی نئی پود نے آخرکار انتظار حسین کو ''دریافت'' کر لیا ہے۔ یہ انتظارستان کی نئی قلم رو ہے۔

حوالہ جات

* آصف فرّخی، مدیر دنیا زاد، کراچی۔

(۱) A. S. Byatt, "True Stories and Facts in Fiction" in *On Histories and Stories: selected essays* (London: Chatto & Windus Random House, 2000), 94.

(۲) محمد حسن عسکری، ''جھلکیاں'' ساقی کراچی (جولائی-اگست ۱۹۵۲ء):۶۔

(۳) عسکری، ۶۔

(۴) بحوالہ: مظفر علی سید، ''انتظارستان میں'' محرابیں (کتابی سلسلہ)(۱۹۹۲ء):۴۵۔

(۵) ممتاز شیریں، ''پاکستانی ادب کے چار سال'' معیار: تنقید (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء)، ۱۷۶۔

(۶) ممتاز شیریں، منٹو نوری نہ ناری مرتب آصف فرخی (کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۵ء)، ۱۳۸۔

(۷) شیریں، منٹو ۱۳۸۔

(۸) شیریں، منٹو ۱۳۹۔

(۹) شیریں، منٹو ۱۳۹۔

(۱۰) سہیل احمد خان، ''انتظار حسین: تنقید کے آئینے میں'' انتظار حسین: ایک دبستان مؤلف ارتضیٰ کریم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ۳۲۱۔

(۱۱) نظیر احمد، ''انتظار حسین کے افسانے'' انتظار حسین: ایک دبستان مؤلف ارتضیٰ کریم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ۵۹۰۔

(۱۲) سراج منیر، ''جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں'' انتظار حسین: ایک دبستان مؤلف ارتضیٰ کریم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ۲۳۶۔

(۱۳) وارث علوی، جدید انسان اور اس کے مسائل (نئی دہلی: نئی آواز، ۱۹۹۰ء)، ص ن۔

(۱۴) سہیل احمد خان، ''انتظار حسین: تنقید کے آئینے میں'' انتظار حسین: ایک دبستان مؤلف ارتضیٰ کریم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)۔

(۱۵) محمد عمر میمن، ''حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت'' سویرا ۵۲-۵۱-۵۰ (مئی ۱۹۷۶ء): ۴۳۔

(۱۶) انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟ (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۱۲ء)۔

کتابیات

A. S. Byatt. "True Stories and Facts in Fiction." In *On Histories and Stories: selected essays.* London: Chatto & Windus Random House, 2000.

احمد، نظیر۔ ''انتظار حسین کے افسانے'' انتظار حسین: ایک دبستان۔ مؤلف ارتضیٰ کریم۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔ ۵۹۷-۵۸۴۔

حسین، انتظار۔ جستجو کیا ہے؟ لاہور: سنگِ میل، ۲۰۱۲ء۔

خان، سہیل احمد۔ ''انتظار حسین: تنقید کے آئینے میں'' انتظار حسین: ایک دبستان۔ مؤلف ارتضیٰ کریم۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

سید، مظفر علی۔ ''انتظارستان میں۔'' محرابیں (کتابی سلسلہ) (۱۹۹۲ء)۔

شیریں، ممتاز۔ معیار: تنقید۔ لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء۔

شیریں، ممتاز۔ منٹو نوری نہ ناری۔ مرتب آصف فرخی۔ کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۵ء۔

عسکری، محمد حسن۔ ''جھلکیاں۔'' ساقی کراچی (جولائی۔اگست ۱۹۵۲ء)۔

علوی، وارث۔ جدید انسان اور اس کے مسائل۔ نئی دہلی: نئی آواز، ۱۹۹۰ء۔

منیر، سراج۔ ''جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں'' انتظار حسین: ایک دبستان۔ مؤلف ارتضیٰ کریم۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔ ۲۳۷-۲۱۸۔

میمن، محمد عمر۔ ''حافظے کی بازیافت، زوال اور شخصیت کی موت۔'' سویرا ۵۲-۵۱-۵۰ (مئی ۱۹۷۶ء): ۶۸-۴۳۔